تحریر: انگ مار کارلسن

انگریزی سے ترجمہ: ادارہ

مغربی دُنیا میں اسلام اور مسلمان — چند پہلو

[جنوب مشرقی یورپ میں مسلمان صدیوں سے آباد ہیں، مگر مغربی یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کا وجود رواں صدی کے نصف آخر میں اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد تباہ حال مغربی یورپ کو تعمیرِ نو کے لیے افرادی قوت کی ضرورت تھی جو اُنہیں اپنی افریقی اور ایشیائی نوآبادیوں سے حاصل ہوئی۔ برصغیر سے لوگ برطانیہ منتقل ہوئے اور شمالی افریقہ سے فرانس۔ اسی طرح ترکی کے ساتھ ماضی کے تعلقات، نیز جغرافیائی قربت کے باعث ترک بڑی تعداد میں جرمنی گئے۔ مغربی یورپ میں اس "نووارد" عنصر میں قابلِ لحاظ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ ان ابتدائی نووارد وں میں زیادہ تر نیم تعلیم یافتہ تھے اور اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ وطن سے باہر نکلے تھے کہ کچھ عرصہ "چار پیسے" کما کر واپس اپنے خاندانوں میں مل جائیں گے، مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ جب اُن کے لیے جلد وطن جانا ممکن نہ رہا تو اپنے افرادِ خاندان کو "نئے وطن" بلانے لگے، اور یوں نہ صرف اُن کی آبادی میں اضافہ ہوا، بلکہ نئے مسائل کے ساتھ اُن کی سماجی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت، مذہبی مراسم کی ادائیگی اور اپنے ہم وطنوں سے وابستگی نے اُنہیں منظم ہونے پر مجبور کیا۔ آج ان "یورپی مسلمانوں" کی دوسری نسل اپنے والدین کے سابق وطن کی نسبت اندازِ زیست کے حوالے سے یورپی معاشرے سے زیادہ قریب ہے۔

وقت کے ساتھ انگلستان، فرانس اور جرمنی جانے والے "مہمان مزدوروں" میں اُن کے کچھ ایسے ہم وطن بھی شامل ہو گئے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، اور بالخصوص طب اور ٹیکنالوجی کے میدان میں میزبان معاشروں کے لیے بڑے سودمند تھے۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں اور سیکنڈے نیویا پہنچ گئے اور اُنھوں نے ان ممالک کی معیشت و معاشرت میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا۔

آج یورپ کے تقریباً ہر ملک میں علمی و تعلیمی، بلکہ سیاسی سطح پر "نووارد" مسلمانوں کے "مسائل" پر غور و فکر کیا جا رہا ہے۔ جناب انگ مار کارلسن (Ingmar Carlson) یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے سویڈن کے وزیر خارجہ کے مشیر ہیں۔ اُنھوں نے تقریباً ایک سال پہلے ۳۰ نومبر ۱۹۹۵ء کو "انسٹی ٹیوٹ فار پولٹیکل اینڈ انٹرنیشنل سٹڈیز" (تہران) میں "اسلام اور مغرب" کے موضوع پر خطاب کیا تھا۔ اُن کے خطاب کا متن The Iranian Journal of

International Affairs (بابت بہار ۱۹۹۶ء) میں شائع ہوا ہے۔ ذیل میں مجلہ مذکورہ کے شکریے کے ساتھ اس خطاب کا اُردو ترجمہ دیا جاتا ہے۔

جناب کارلسن کے خطاب سے دوسرے امور کے ساتھ یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ یورپی فیصلہ ساز اپنے درمیان مسلمانوں کو کس کس نظر سے دیکھ رہے ہیں، اور بحیثیتِ مجموعی مسلم دُنیا کے بارے میں اُن کی رائے کیا ہے۔ مدیر]

جب اڑھائی تین سال پہلے [امریکی جریدے] سہ ماہی "فارن افیرز" میں ایک مقالہ س The Clash of Civilizations (تہذیبوں کا تصادم) کے عنوان سے شائع ہوا تو اسے خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ مقالہ نگار سیموئیل ہَن ٹِنگٹن نے دعویٰ کیا تھا کہ عالمی سطح پر سیاسی طرزِ عمل ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے اور تاریخ کے آئندہ مرحلے میں کشمکش مختلف ثقافتی دوائر میں ہو گی۔ پروفیسر موصوف کے خیال میں اگر آئندہ کوئی عالمی جنگ ہوئی تو یہ سیاسی نظریوں یا ریاستوں کے درمیان نہیں، بلکہ دو تہذیبوں کے درمیان ہو گی۔ جناب ہَن ٹِنگٹن نے اسلام کو "مغربی تہذیب" کے بڑے دشمن کے طور پر پیش کیا ہے اور تصویر کشی اس طرح کی ہے کہ عالمی سطح پر منظم اسلامی تحریک (Islamic International) سے مغرب کو شدید خطرہ درپیش ہے۔

ہَن ٹِنگٹن کے بقول اسلام کی سرحدیں خونیں ہیں۔ یہ بیان نہ صرف تاریخی اعتبار سے جھوٹ پر مبنی ہے، بلکہ ازحد خطرناک بھی ہے۔

بڑے بڑے تاریخی افسانوں میں سے ایک یہ ہے کہ ۷۳۲ء میں چارلس مارٹل نے Piotiers کے مقام پر مسلمانوں کو شکست دے کر مغرب کو تباہی سے بچا لیا تھا۔ مسلمانوں کو پائرنیز (Pyrenese) سے واپس جنوبی اسپین کی طرف دھکیل دیا گیا جہاں ایک مسلمان ریاست تقریباً آٹھ سو سال قائم رہی، تاہم براعظم یورپ میں مسلمانوں کی اس موجودگی سے مغربی تہذیب تباہ نہیں ہوئی، بلکہ یہ موجودگی اسلام، مسیحیت اور یہودیت کے درمیان ایک مثالی اور پُرثمر تعاون پر منتج ہوئی۔ اس تعاون کے نتیجے میں فنونِ لطیفہ، ثقافت، فلسفہ اور سائنس میں عدیم النظیر ترقی ہوئی۔

ہماری تہذیب اور تمدّن اسلام کے کس قدر مرہونِ احسان ہیں، اور مسلمان علماء نے اُن یونانی علوم وفنون کی ترقی و تحفظ میں جنہیں ہم مغربی تہذیب کی بنیاد قرار دیتے ہیں، کیا کردار ادا کیا، اس بارے میں لوگ بہت زیادہ واقف نہیں۔ مسلمانوں نے نہ صرف قدیم یونان اور روم کا فکری سرمایہ محفوظ رکھا، بلکہ اُنھوں نے تشریح و تعبیر کے ذریعے اس میں اضافے کیے اور انسانی تلاش و جستجو کے متعدد میدانوں میں اُن کے کارنامے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

قرونِ وسطیٰ کے آخر میں اسلام اور یہودیت یورپ کے تشکیلی عناصر بن چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہے

کہ اسلام بیک وقت اجنبی ہے اور اپنا بھی، اور بڑھتی ہوئی نقلِ مکانی کے باعث آج کے یورپ میں ایک نیا عنصر ہے۔ مغربی یورپ میں مسلمانوں کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ سویڈن کی آبادی نوے لاکھ سے کم ہے، مگر دو لاکھ نووارد اسلامی پس منظر رکھتے ہیں اور یوں پروٹسٹنٹ ریاستی چرچ کے بعد مسلمان سب سے بڑی مذہبی برادری ہیں۔ آج اسلام اسی طرح سویڈن کا ایک مذہب ہے جیسے مسیحیت اور یہودیت ہیں۔

یہ صورتِ حال رڈیارڈ کپلنگ کے مشہور جملے کی تردید کے لیے کافی ہے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، اور دونوں کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔" نہ صرف دونوں مل سکتے ہیں، بلکہ اُنہیں باہم ملنا چاہیے اور یہ ملاپ عملاً ہو رہا ہے۔ اگرچہ دونوں طرف ایسی قوتیں موجود ہیں جو بحیرۂ روم کو خطِ تقسیم بنانا چاہتی ہیں۔

آئندہ ۲۵ برسوں میں یورپ میں مسلمانوں کی آبادی کے بارے میں اندازے اڑھائی کروڑ سے چھ کروڑ تک ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ مسلمانوں کی آبادی کے بارے میں کون سا اندازہ صحیح ثابت ہوتا ہے، مستقبل کی یورپی یونین اسلام کے سبز عنصر کے بغیر ذہن میں نہیں آتی۔ اگر ہم اسلام کے بارے میں بن ٹنگلٹن کی اس بات سے اتفاق کریں کہ مغرب اور اسلام کے درمیان صرف خونیں رابطہ ہی ناگزیر ہے تو ہم اپنی مسلمان آبادی کو کبھی اپنا حصہ نہ بنا سکیں گے۔

اس تناظر میں، ترکِ وطن کر کے آنے والے مسلمانوں کو آبادی کا واقعی حصہ بنانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے؟ اس طریقے یا عمل کا مقصد سماجی اور معاشی ہونا چاہیے، تاہم اپنی اقدار کو پورا مقام دیتے ہوئے آنے والے مسلمانوں کی اس خواہش کا احترام کیا جائے کہ اُن کی مذہبی و ثقافتی شناخت برقرار رہے۔ اس کے لیے [مسلمانوں میں] "مقامی" قیادت کا ابھرنا ضروری ہے، تاکہ اسلام کے ساتھ چپکے ہوئے اس لیبل کو الگ کیا جا سکے کہ یہ ایک اجنبی اور خطرناک مذہبی ذہن ہے۔ یہ مقامی قیادت نہ صرف اُن لوگوں پر مشتمل ہو گی جو یورپ میں پیدا ہوئے ہیں، بلکہ اس میں یورپی نو مسلم بھی شامل ہوں گے۔ بیشتر مسلمان یہ بات سمجھتے ہیں کہ اُنہیں اپنے نئے وطن کے قوانین اور ضوابط کا احترام کرنا چاہیے، مگر کبھی کبھی یہ خواہش اُن مذہبی اور سیاسی جنونیوں کی وجہ سے دب جاتی ہے جو یورپ میں اپنی جلاوطنی کے دوران میں اپنے اصل ملکوں کے خلاف یا اپنے اندرونی اختلافات کے سبب تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ آمرانہ خیالات اور نظریات کو کسی صورت میں برداشت نہ کیا جانا چاہیے۔ اسلام کے ساتھ ہمیں ایک مذہب کی حیثیت سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے اور اس امر کو یقینی بنانا چاہیے کہ مذہب پر عمل کرنے میں مسلمانوں کو کوئی دقت نہ ہو، تاہم ہمیں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کرنا چاہیے کہ ملکی قوانین کی پابندی لازمی ہے۔

مذکورہ بالا صورتِ حال کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تمام مذہبی مظاہر کو انتہا پسندی یا ہمارے

معاشروں کا حصہ نہ بننے کی خواہش کے مترادف خیال کرنے سے ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔ ترک وطن کر کے آنے والوں کے درمیان اسلامی لگاؤ صرف اسی صورت میں خطرناک ہے جب یہ مذہبی و نسلی طور پر متنوع معاشرے یا جمہوری ریاست کے اصولوں کے خلاف ہو۔ مسلمان ملکوں سے آنے والے متعدد افراد میں مذہب سے لگاؤ یا پرہیزگاری اس احساس کے خلاف ردعمل ہے کہ وہ کہیں کے بھی نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے مذہبیت اُن کے اپنے ثقافتی پس منظر سے کٹ جانے کا نتیجہ ہے اور یہ لازماً اُن نئے معاشروں کے خلاف احتجاج نہیں جن میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مذہبیت یورپ کے سیکولر ماحول کو برداشت نہ کرنے کے مترادف نہیں ہے، بلکہ ممکن ہے اس سے وہ تحمل پیدا ہو جو رواداری اور وحدت کے لیے ضروری ہے۔

ایک لازمی شرط یہ ہے کہ ہم یورپی لوگ اسلام کی رنگا رنگی اور مسلمان تارکین وطن کے متنوع پس منظر کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کریں اور جس قدر ممکن ہو جناب ہن ٹنگٹن کے فرضی منفی تناظر سے باہر نکلیں۔ جہاں تک مسلمان نوواردوں کی عظیم اکثریت کا تعلق ہے، اُن کے لیے مذہب کے ثقافتی، بالخصوص اُنہیں شناخت مہیا کرنے والے پہلو بہت اہم ہیں۔

صرف روادار اسلام ہی یورپ کا حصہ بن سکتا ہے، اور یہ یک جائی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے ساتھ اقتصادی اور سماجی وحدت (Integration) موجود ہو۔ اس قسم کی وحدت کے لیے ضروری ہے کہ نقل مکانی پر کنٹرول ہو اور اس بارے میں پورے یورپ کی ایک مشترک پالیسی ہو۔ جو تارکین وطن نئے معاشروں کا حصہ بننے کے خواہش مند ہیں، اُنہیں محسوس کرنا چاہیے کہ اُن کے لیے میزبان معاشروں کے دروازے کھلے ہیں اور وہ ان معاشروں کا حصہ ہیں۔ "بے وطنی" کا احساس، انتہا پسندوں کو مناسب پرورش گاہ مہیا کرتا ہے جو غربت زدہ اور مفلوک الحال آبادیوں کے مکینوں کی "روحانیت" سے یہ کہہ کر فائدہ اٹھاتے ہیں کہ تمہارا ان لوگوں سے کوئی تعلقِ خاطر ہے اور نہ وطن میں اخلاق باختہ اور بدکردار حکومت سے، تمہیں ان دونوں کے خلاف جدوجہد کرنا ہے۔"

اگر نووارد مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو یورپی معاشرے کا حصہ سمجھیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ

- اسلام کو ایک "مقامی [یعنی یورپی] مذہب" سمجھا جائے اور تسلیم کیا جائے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے یہ احساس ہو کہ مسلمان اتنا اچھا سویڈش شہری نہیں بن سکتا، جتنا کوئی مسیحی یا پُرجوش یہودی بن سکتا ہے۔ یا مسجدیں سویڈن کے شہروں کا ویسا فطری حصہ نہیں بن سکتیں جیسے چرچ صدیوں سے حمص، دمشق، موصل یا قاہرہ کا حصہ چلے آ رہے ہیں۔
- اسلامی عقائد کی تعلیم نہ صرف بہتر بنائی جائے، بلکہ اسے ہمارے سکولوں میں لازمی قرار دیا جائے۔

مشترکہ بنیاد پر اسلام کے خوفناک ہونے کا تاثر زائل کیا جائے۔ عدم واقفیت تعصب اور نفرت کو جنم دیتی ہے۔ اس حوالے سے ذرائع ابلاغ کو بھی اسلام کے بارے میں اپنے اُس لگے بندھے اور سطحی تاثر کو درست کرنا چاہیے جو ان دنوں پیش کیا جا رہا ہے۔

• ہمارے معاشرے پر اُس شخص کو تحفظ دیں جو اِن کا حصہ بننا چاہتا ہے، مگر اُسے مقامی انتہا پسندوں، جو تارکینِ وطن کے سخت خلاف ہیں، یا مسلم انتہا پسند گروہوں سے خطرہ لاحق ہے۔

• نووارد مسلمانوں کو اپنے نظریات اور خواہشات کے اظہار کا موقع ملنا چاہیے۔

• ہم ترقی و تعاون اور خارجہ تعلقات کی ایسی پالیسیاں اپنائیں جن کا مقصد ترکِ سکونت کا بوجھ کم کرنا ہو تاکہ سیاسی و انسانی حوالے سے یہ عمل بہتر طور پر انجام پا سکے۔

اگر اس طرح ترکِ وطن کر کے آنے والوں کو جذب کر لیا جائے تو یورپ کی اسلامی برادری یعنی "یورپی مسلمان" یورپ اور اُن ملکوں کے درمیان رابطے کا کردار ادا کر سکتے ہیں جن سے اُن کا تعلق رہا ہے۔ چونکہ مسلمان اپنے اصل ملکوں سے تعلق قائم رکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں، اس لیے یورپی مسلمانوں کے ذریعے سہ طرفہ مفید تعلقات —— مسلمان برادریوں، اُن کے اصل وطنوں اور اُن کے نئے ملکوں کے درمیان —— استوار ہونے کا امکان ہے۔

اس کے برعکس اگر تارکینِ وطن کو جذب کرنے کا عمل ناکام ہو جاتا ہے اور مسلم پس منظر رکھنے والے نووارد محسوس کرتے ہیں کہ اُنہیں مذہبی طور پر کم تر سمجھا جاتا ہے، وہ غریب بستیوں میں رہنے پر مجبور ہیں اور سماجی طور پر اُن کے اثرات کم کر دیے گئے ہیں، جیسا کہ اُن میں بے روزگاری پچاس فیصد سے زیادہ ہے، تو ہمیں یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ تارکینِ وطن کی نواحی بستیوں میں زیرِ زمین قرآنی اسکول قائم ہوں گے اور اُن میں ایسے استاد ہوں گے جو اپنے تصورات کی رُو سے اپنے طلبہ کو تلقین کریں گے کہ ظلم و جبر پر مبنی یورپی معاشرے کے خلاف جدوجہد میں وہ اُن تمام ذرائع سے کام لیں جو اُن کی دسترس میں ہیں۔

اگر حالات یہ رُخ اختیار کرتے ہیں تو مسلمان متشدّد تنظیمیں مغربی دُنیا جسے وہ برائی کی مجسّم شکل قرار دیتی ہیں، کے خلاف جدوجہد کریں گی۔ اس صورت میں ہمارے اندازوں سے بھی بہت پہلے مغربی یورپ میں "جہاد" شروع ہو جائے گا۔ اس کی شکل "مغرب" اور مسلمان دُنیا کے درمیان عسکری تصادم کی نہیں ہوگی، بلکہ ہمارے بڑے شہروں کی غریب نواحی بستیوں میں گوریلا جدوجہد کی ہوگی۔

خارجہ پالیسی کے دائرے میں ہمیں نئی راہیں تلاش کرنا چاہییں کہ اسلام اور مسیحیت یا دو ثقافتی دوائر کے درمیان بڑھتی ہوئی کشمکش دو سیاسی اور اقتصادی نظاموں کے درمیان سابق "سرد جنگ" کی جگہ نہ لے لے۔

مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وقتاً فوقتاً پیش آمدہ مسائل کے حقیقی اسباب معلوم کیے جائیں۔ یہ مقصد

ہر سطح پر مکالمہ جاری رکھ کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۹۴ء کے اواخر میں سویڈن کی حکومت نے اسلامی اور یورپی ثقافتوں کے درمیان روابط اور یورپ میں مسلمانوں کی صورت حال پر ایک کانفرنس منعقد کی۔ یہ قدم اس ایقان کے ساتھ اٹھایا گیا تھا کہ خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی تعاون کو صرف شدید مسائل تک ہی محدود نہ ہونا چاہیے، بلکہ مستقبل کے بنیادی مسائل پر بھی غور و فکر کیا جائے۔ تدارک آمیز (preventive) ڈپلومیسی کے اصول پر مبنی خارجہ پالیسی کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے، اور اس پالیسی میں یہ بھی شامل ہے کہ ثقافتی دائرے میں اعتماد بحال کیا جائے۔

مذکورہ کانفرنس کی نوعیت سرکاری یا سفارتی نہیں تھی۔ کم و بیش ایک سو مرد و زن کو اُن کی ذاتی حیثیت میں دعوت دی گئی تھی اور کانفرنس کا اہتمام ایک آزاد ادارے "سویڈش انسٹی ٹیوٹ" نے کیا تھا۔ دو ایرانی شرکاء جناب محمد جواد لاریجانی اور پروفیسر محمد مجتہد شبستری نے کانفرنس میں قابلِ قدر خیالات کا اظہار کیا۔

اختتامی بیانات اور کلیدی خطابات سے قطع نظر چھ ورکنگ گروپوں میں جن مسائل پر بحث مباحثہ کیا گیا، ان میں یہ شامل تھے: لگے بندھے تصورات اور ایک دوسرے سے خطرے پر مبنی خیالات سے کس طرح بچا جا سکتا ہے؟ اطلاعات اور ثقافتوں کا حقیقی تبادلہ کس طرح ممکن ہے؟ معاصر مثالوں اور تاریخ سے کیا سبق سیکھا جا سکتا ہے؟ باہم جذب و وحدت یا تنوع پسندی؟ ثقافتی رنگا رنگی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے؟ مستقبل میں مذہب، جمہوریت اور معاشرے کی کیا شکل ہوگی؟ اسلام میں مرد و زن اور بچوں کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے؟

کانفرنس کے انعقاد کے وقت یہ پیش نظر نہیں تھا کہ یہ محض ایک وقتی مشق ہوگی جس سے کوئی مشترک اعلامیہ حاصل کرنا یا ثقافتی پالیسی کے تحت ایک پروگرام کرنا ہے۔ اس کے برعکس کانفرنس کو اس عمل کا نقطہ آغاز خیال کیا گیا جس میں مختلف پلیٹ فارموں پر مندرجہ بالا موضوعات پر مسلسل مکالمہ جاری رہے گا۔---